© rasailojaraid.com

نظرات

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا المیہ

سخت افسوس اور رنج ہے کہ علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کا مریض ناتواں جو دو ڈھائی برس سے چند در چند امراض مزمنہ کا شکار ہونے کے باعث عالم امید و یاس میں کشمکش موت و زیست سے دوچار تھا ۱۲ مئی کی سہ پہر کو اچانک دم توڑ گیا جب کہ ایک معصوم و بیگناہ نوجوان طالب علم پولیس کی گولی کا نشانہ بنا، زخموں سے چور ہو کر زمین پر گرا اور چند گھنٹے بعد دنیا سے رخصت ہو گیا، یونیورسٹی جو ایک ماہ تک بند رہنے کے بعد ابھی پچھلے دنوں کھلی تھی، پھر دوبارہ غیر معینہ مدت کے لیے بند کر دی گئی، طلبا اور طالبات آگے پیچھے سب ہوسٹل خالی کر گئے، لڑکوں کا مطالبہ تو تھا ہی کہ وائس چانسلر اور پرو وائس چانسلر استعفا دیں، ۱۲ مئی کے واقعہ کے بعد ملازمین یونیورسٹی کی یونین نے بھی ایک جلسہ کر کے اعلان کیا کہ وہ موجودہ وائس چانسلر کی موجودگی میں اپنے اپنے دفتر نہیں آئیں گے اور کام نہیں کریں گے ساتھ ہی اسٹاف ایسوسی ایشن نے جلسہ کر کے نہایت درشت لب و لہجہ میں ایک متفقہ تجویز کے ذریعہ وائس چانسلر اور ان کے رفیق سے مطالبہ کیا کہ "تاخیر مزید کے بغیر یونیورسٹی سے الگ ہو جائیں، ورنہ جب تک وہ رہیں گے ہم کام نہیں کریں گے" ان سب چیزوں کا نتیجہ یہ ہے کہ ان سطور کے لکھے جانے تک یونیورسٹی کیمپس ایک شہر خموشاں اور ایک بلدۂ ویران و سنسان بنا ہوا ہے، ہر دفتر بند اور ہر ادارہ مقفل ہے. یہاں تک کہ لائبریریاں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شفاخانہ، میڈیکل کالج، رجسٹرار آفس جو تعطیلات کے دنوں میں بھی بند نہیں ہوتے اب وہ بھی بند ہیں اور یونیورسٹی کی تمام عمارتوں پر حسرت و یاس برس رہی ہے، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ واقعہ اپنی نوعیت کا ایک اور نہایت افسوس ناک اور تشویش انگیز واقعہ ہے جس کی کوئی نظیر یونیورسٹی کی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔

جب کبھی اس قسم کا کوئی واقعہ پیش آتا ہے ہر فریق ایک دوسرے پر الزامات کی بوچھار شروع کر دیتا ہے اور کوئی اپنی خطا یا غلطی کا اعتراف کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتا چنانچہ اس مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا، طلباء کا دعویٰ ہے کہ اس کی ذمہ داری تمام تر وائس چانسلر کے سر ہے، اور وائس چانسلر اور ان کے ساتھیوں کے نزدیک اس کے ذمہ دار طلباء اور اساتذہ کا ایک گروپ ہے، حالانکہ ایک یہ کیا دنیا کا کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ہے جس میں سب ارباب واقعہ کا، کسی کا کم کسی کا زیادہ، کچھ نہ کچھ حصہ نہ ہو، خلیل جبران نے ایک ناول میں خوب کہا ہے: "درخت کا ایک پتہ بھی اگر گرتا ہے تو پورے درخت کی خاموش رضامندی کے بغیر نہیں گرتا" اس بناء پر ہمارے نزدیک کسی ایک فریق کا دوسرے کو الزام دینا غلط ہے، بلکہ اس کی ذمہ داری وائس چانسلر، اساتذہ اور طلباء سب پر عائد ہوتی ہے، اور اس لیے اگر اس یونیورسٹی کو زندہ رکھنا ہے تو یہ موقع ایک دوسرے پر الزام تراشی کا ہرگز نہیں ہے، بلکہ گریبان میں منہ ڈال کر احتساب نفس کرنے کا ہے۔

اصل یہ ہے کہ آج کل ہمارا ملک تہذیبی اور اخلاقی اعتبار سے جس شدید اتھل پتھل کی حالت میں مبتلا ہے ہماری قومی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جو اس سے متاثر نہ ہو، حد یہ ہے کہ مسلمانوں کے تعلیمی ادارے اور مذہبی درسگاہیں تک اس سے متاثر ہیں، اگرچہ تاثر کی صورتیں اور اس کے مظاہر مختلف ہیں، سخت افسوس اور دکھ کی بات ہے کہ اس عام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

صورتِ حال سے ہماری علیگڈھ مسلم یونیورسٹی بھی مستثنیٰ نہیں ہے، اس بنا پر یونیورسٹی کے اعضاء و جوارح بھی خودغرضی اور مطلب پرستی کی اس رو میں بہنے لگے ہیں جس میں ملک کے دوسرے ادارے بہہ رہے ہیں اور وہ بالکل فراموش کر بیٹھے ہیں اس حقیقت کو کہ ان کی یونیورسٹی ایک خاص کلچرل یونیورسٹی ہے، وہ اسلامی تہذیب و ثقافت کی نمائندگی کرتی ہے اور اس حیثیت سے اس یونیورسٹی کی جو گذشتہ روایات اور تاریخ رہی ہیں وہ کس درجہ عظیم الشان اور نمایاں و ممتاز رہی ہیں، اب موجودہ نسل کو کون یاد دلائے کہ سرسید اور ان کے رفقار نے محمڈن کالج کو جو بعد میں یونیورسٹی میں تبدیل ہو گیا ایک اقامتی تعلیمی ادارہ محض اس عزم اور جذبہ سے بنایا تھا کہ یہ ادارہ مثل ایک خاندان کے ہوگا جس میں اساتذہ اور طلباء اور ملازمین سب اسلامی روایات کے مطابق ایک خاندان کے چھوٹے بڑے افراد کی طرح مل جل کر محبت و شفقت اور ادب و احترام کے ساتھ رہیں گے اور سب مشترکہ طور پر عزم اور خلوص کے ساتھ اس عظیم مقصد کے لیے کام کریں گے جس کے لیے یہ کالج قائم کیا گیا تھا، یعنی ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ نے مسلمانوں کو جس قعرِ پستی و مذلت میں گرادیا تھا اعلیٰ تعلیم و تربیت کے ذریعہ مسلمانوں کو اس پستی سے نکال کر ملک میں ایک باعزت اور پروقار زندگی بسر کرنے کے قابل بنایا۔ اس بنا پر یہ کالج صرف ایک تعلیم گاہ نہ تھا بلکہ ایک مرکزِ تہذیب و تربیت بھی تھا اور جو لوگ اس کالج سے فارغ ہو کر نکلتے تھے ان کا ایک کیرکٹر ہوتا تھا، زندگی اور اس کے مسائل کے بارہ میں وہ اپنا ایک مخصوص نقطۂ نگاہ رکھتے اور ان اوصاف و کمالات کے باعث ملک میں اور بیرونِ ملک وہ عزت و احترام سے دیکھے جاتے تھے۔

پھر جب ۱۹۲۰ء میں کالج ترقی کر کے یونیورسٹی بنا تو دنیا نے دیکھا کہ یونیورسٹی کس عزم اور یقین کے ساتھ سرسید کے مشن اور ان کے نصب العین کی حفاظت کرتی اور سرسید کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بتائے ہوئے لائحہ عمل پر چلتی رہی ایک خاندان ہونے کی اس کی روایت برقرار رہی، اساتذہ اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوتے تھے لیکن، درس و تدریس اور طلباء کی تربیت کا کام ایک مقدس فریضہ سمجھ کر انجام دیتے تھے، ان میں حرص اور طمع نہیں تھی، انھیں جو تنخواہ ملتی تھی اس پر قناعت کر کے صاف ستھری مگر سادہ زندگی بسر کرتے تھے، انھیں اپنے مضمون سے عشق ہوتا تھا، مطالعہ کے ذریعہ وہ اپنی معلومات میں اضافہ کرتے رہتے تھے، طلباء کو اپنی اولاد سمجھتے تھے اور ان کے دکھ درد میں ان کے شریک ہوتے تھے، وہ راست باز، محنتی اور مخلص ہوتے تھے، اسی طرح طلباء اپنے والدین کی طرح ان سے محبت اور ادب و احترام کا معاملہ کرتے اور ان پر اعتماد کرتے تھے، بچے بہر حال بچے ہوتے ہیں، کبھی حق یا ناحق مچل بھی جاتے ہیں، اس لیے اسٹرائکیں اس زمانہ میں بھی ہوتی تھیں لیکن کیا مجال کہ کوئی لڑکا کسی استاد کو گالی دے یا اس پر ہاتھ اٹھائے، جب لڑکوں کی طرف سے اس بات کا اطمینان تھا تو حکام یونیورسٹی کو کیا ضرورت تھی کہ وہ پولیس کو طلب کرے۔ وائس چانسلر جو اس خاندان کا سب سے بڑا ہوتا تھا وہ اور اساتذہ دونوں طلباء سے مفاہمت کر لیتے تھے اور معاملہ ختم ہو جاتا تھا۔ ہم نے یہ زمانہ خود نہیں دیکھا، سنا بہت کچھ ہے، البتہ کرنل بشیر حسین زیدی اور بدرالدین طیب جی کی وائس چانسلری کے عہد میں اس دور اولین کی ایک جھلک دیکھی ہے۔

غرض کہ جس دور کا یہ تذکرہ ہے وہ یونیورسٹی کا عہد زریں اور خیر القرون تھا جبکہ یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد، اساتذہ اور طلباء تعمیر ملت و قوم کے مقصد کے پیش نظر ہم آہنگی اور یک جہتی کے ساتھ مل جل کر کام کرتے تھے، اختلافات کہاں نہیں ہوتے؟ وہاں بھی تھے، لیکن یہ اختلافات ہم آہنگی کے ساتھ کام کرنے میں رکاوٹ نہیں بنتے تھے، لیکن آج صورت حال بالکل برعکس ہے، یونیورسٹی کے لیے اقلیتی کردار کے مطالبہ سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ملک کے بام و در عرصہ سے گونج رہے ہیں لیکن اس بات کا احساس کسی کو نہیں ہے کہ ملک کی تقسیم نے پسماندگی اور زبوں حالی کے اعتبار سے مسلمانوں کو پھر اسی مقام پر لا کھڑا کر دیا ہے جہاں وہ ۱۸۵۷ء کے نتیجہ میں سر سید کے زمانہ میں تھے، اس بنا پر سخت ضرورت تھی کہ سر سید اور ان کے رفقاء نے اس زمانہ میں جس دل کی لگن اور مخلصانہ محنت و مشقت اور عزم و حوصلہ کے ساتھ کام کیا تھا ہم بھی اسی جذبہ و ولولہ اور ہم آہنگی کے ساتھ مسلمانوں کی تعمیر نو کے لیے کام کرتے، آپس میں اگر کچھ تلخیاں اور ناگواریاں ہوتیں بھی تو مبتنی کر مشہور مصرعہ: وعند الشدائد تذهب الاحقاد " جب مصیبتیں پڑتی ہیں تو آپس کی رنجشیں دور ہو جاتی ہیں' کے مطابق ایک اعلیٰ مقصد کی خاطر ان تلخیوں اور ناگواریوں کو پی جاتے اور ان کو اتنی اہمیت نہ دیتے کہ منزل مقصود ہی نظروں سے اوجھل ہو جاتی۔ مسلمان بیشک اقلیت میں ہیں لیکن اگر اقلیت میں غیرت و حمیت قومی اور جذبۂ عمل ہو تو اقلیت میں ہونا خدا کی رحمت اور اس کا فضل و کرم خاص ہے۔ کیونکہ اکثریت اپنے احساس برتری کے گھمنڈ میں جمود و تعطل کا شکار ہو جاتی ہے اور اس کے برخلاف اقلیت جہاد زندگی میں عزم و حوصلہ کے ساتھ مصروف عمل رہتی ہے تو آخر ایک وقت آتا ہے جب کہ اپنی مملکت کے نظم و نسق کے لیے خود اکثریت اقلیت سے مدد کی خواہاں اور طلبگار ہوتی ہے، یہی وہ حقیقت ہے جس کو قرآن مجید میں وکم من فئة قليلة غلبت فئة كثيرة فرما کر بیان کیا گیا ہے۔ وقت کا منادی چیخ چیخ کر پکار رہا ہے، حوادث ہیں کہ للکار رہے ہیں مگر صد افسوس! اس آواز کو کوئی نہیں سنتا، نہ اساتذہ سنتے ہیں اور نہ طلباء، کیونکہ طلباء، اساتذہ کی شفقت و محبت اور ان کی توجہ و رہنمائی سے محروم ہونے کے باعث بے یقینی اور پراگندگیٔ فکر و خیال کا شکار ہیں اور اساتذہ راحت طلبی اور ہوس جلب زر کے صید زبوں! نتیجہ یہ ہے کہ آج یونیورسٹی میں خاک اڑ رہی ہے، کرپشن عام ہے، ڈسپلن مفقود ہے اور تعلیم کا ستیاناس ہو رہا ہے۔ ہزاروں طلباء

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور طالبات کی زندگی کے قیمتی لمحات برباد جارہے ہیں، اور لاکھوں روپے ماہوار بے مصرف خرچ ہو رہے ہیں: وائے گر در پس امروز بود فردائے۔

جیساکہ ہم نے شروع میں کہا ہے ۱۲ مئی کو جو حادثۂ فاجعہ پیش آیا یا اس سے پہلے اسی سلسلہ کے جو واقعات پیش آئے تھے ان کی ذمہ داری کسی ایک فریق پر نہیں بلکہ سب پر عائد ہوتی ہے، لیکن یہ ظاہر ہے کہ جو جس مرتبہ و مقام پر ہے اس کی ذمہ داری بھی اسی حساب سے ہو گی۔

وائس چانسلر یونیورسٹی کا سربراہ اور صدر انتظامیہ ہوتا ہے اس لیے لازمی طور پر اس معاملہ میں بھی سب سے بڑی ذمہ داری اور مسئولیت صدر انتظامیہ کی ہی ہو گی۔ وائس چانسلر سید حامد صاحب بے شبہ ذاتی طور پر نہایت شریف اور بڑے فاضل و قابل انسان ہیں، ان کی دیانتداری اور خلوص پر بھی شک نہیں کیا جا سکتا، لیکن یونیورسٹی کا ایڈمنسٹریشن ان کی زندگی کا پہلا اور نیا تجربہ تھا، جون ۸۰ء میں اپنے عہدہ کا چارج لینے کے بعد جب کہ یونیورسٹی بند تھی انھوں نے دفتروں کی اصلاح و ترقی اور ان میں حسنِ کارکردگی کی رفتار کو بڑھانے کے لیے جو اقدامات کیے وہ ضرور قابلِ تعریف تھے اور ان کی شہرت ہوئی بھی، لوگ اس زمانہ میں ان کی تعریف ہمارے سامنے کرتے تھے تو ہم کہتے تھے کہ ابھی کیا ہے؟ تیل دیکھیے، تیل کی دھار دیکھیے، وائس چانسلر کا اصل ٹسٹ یہ ہے کہ وہ طلبا، اور اساتذہ کے معاملات سے کس طرح عہدہ برآ ہوتا ہے۔' چنانچہ یونیورسٹی کھلنے کے بعد جب طلبائے سے سابقہ ہوا تو ہمارے اندیشے غلط ثابت نہیں ہوئے۔ ایک وائس چانسلر جس کو اپنے عہدہ کا چارج لیے ہوئے ابھی پورا ایک برس بھی نہیں ہوا اگر اس کے اس مختصر عہد میں پولیس کو دو مرتبہ یونیورسٹی کیمپس میں ڈیرا ڈالنا پڑے اور اس کے نتیجہ میں یونیورسٹی دو مرتبہ بند ہو تو ایڈمنسٹریشن کو کامیاب نہیں کہا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جا سکتا۔

ایک کامیاب ایڈمنسٹریشن کے لیے ضروری ہے کہ (۱) جب کبھی کوئی اہم معاملہ پیش آئے اس کے تمام پہلوؤں پر سنجیدگی اور ایمانداری سے غور و فکر کرے، ارباب دانش و تجربہ سے مشورہ کرے اور پھر فیصلہ جلد کرے، ٹال مٹول سے کام نہ لے اور (۲) پھر جب فیصلہ کرلے تو اسے پوری قوت سے نافذ کرے اور اس معاملہ میں کسی دباؤ اور سفارش کو قبول نہ کرے (۳) علاوہ ازیں کسی چیز کا فیصلہ کرتے وقت قانون کی اندھی پیروی نہ کرے بلکہ مصلحت شناسی اور بیدار مغزی سے بھی کام لے، حضرت عمر فاروق سے بڑا اور زبردست ایڈمنسٹریٹر کون ہوسکتا ہے؟ لیکن وہ بھی مصلحت شناسی کے قائل تھے، چنانچہ ایک مرتبہ آپ نے حضرت سعد بن ابی وقاص کو جو عشرۂ مبشرہ اور سابقین اولین میں سے ہیں کوفہ کا گورنر مقرر فرمایا، کوفہ والے پہلے تو ان سے خوش رہے اور پھر حسب عادت ان کی الٹی سیدھی شکایتیں دربارِ خلافت میں پہنچانی شروع کردیں، نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت عمر نے ان کو معزول کردیا مگر ساتھ ہی فرمایا: میں جانتا ہوں کہ سعد بن ابی وقاص کے خلاف اہل کوفہ کی شکایتیں سرتاسر غلط اور بے بنیاد ہیں، لیکن اس کے باوجود انتظامی مصلحت کا تقاضہ تھا کہ سعد کو کوفہ سے ہٹا دیا جائے، حضرت عمر کا یہ فیصلہ اس امر کی صاف دلیل ہے کہ ایک ایڈمنسٹریٹر کو صرف یہ دیکھنا نہیں ہے کہ قانون کیا ہے بلکہ اسے یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ اس کا ماحول کیا ہے؟ حالات کس قسم کے ہیں؟ اور قانون کے مطابق اس وقت اس کے فیصلہ کا ردعمل کیا ہوسکتا ہے؟۔

ہمارے تجربہ اور مشاہدہ کے مطابق سید حامد صاحب میں ان تین باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی نہیں ہے۔ ہمیں ان کی کمزوری کا پہلا تجربہ اس وقت ہوا جب کہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ـھوں نے یونیورسٹی میں بڑے اہتمام و انتظام سے بین الاقوامی سطح پر پندرھویں صدی ہجری
ـا تقریبات کو منانے کی غرض سے سابق وائس چانسلر پروفیسر خسرو کی مقرر کی ہوئی کمیٹی
ـوڑدی اور اس کی جگہ ایک اور وسیع تر کمیٹی کی تشکیل کی جس کے سکریٹری یونیورسٹی کے ایک
ـینیئر پروفیسر مقرر کیے گئے، چند لوگوں کے کہنے سننے پر حامد صاحب جلد بازی میں
ـیک فیصلہ تو کر بیٹھے لیکن اس فیصلہ کو نافذ نہیں کرا سکے، اس کا افسوسناک نتیجہ یہ ہوا کہ
ـہلی کمیٹی تقریبات کے سلسلہ میں کافی کام کر چکی تھی۔ اس پر یونیورسٹی کا جو روپیہ خرچ
ـ ہو چکا تھا وہ سب برباد ہو گیا اور دنیا بھر میں یونیورسٹی کی بدنامی اور رسوائی الگ ہوئی، پھر طلبا
ـ ایجی ٹیشن شروع ہوا تو پروفیسر عرفان حبیب کے معاملہ میں بھی انھوں نے اس کمزوری
ـ مظاہرہ کیا، وہ قطعی کوئی فیصلہ نہیں کر سکے، کبھی کچھ کہا اور کچھ کیا، ایک بات جم کے نہ
ـہہ سکے اور نہ کر سکے، اس درمیان میں لڑکے گرفتار ہوئے، جیل میں رہے، پھر رہا بھی ہوئے،
ـنیورسٹی بند ہوئی اور پھر کھلی بھی، مگر جس بات پر ہنگامہ ہوا تھا وہ پھر بھی ویسی کی ویسی رہی،
ـسے کون شخص اچھا ایڈمنسٹریشن کہہ سکتا ہے؟ اس کے بعد یونین کے ختم کرنے کے معاملہ
ـ بھی ان سے یہ فروگذاشت ہوئی کہ انھوں نے صرف یہ دیکھا کہ دستور کیا ہے اور اس بات
ـ لحاظ نہیں رکھا کہ یونیورسٹی کی موجودہ فضا میں اس کا ردعمل کیا ہو سکتا ہے؟ ورنہ
ـنہیں اگر اس کا خیال ہوتا تو اس کی پیش بندی کے لیے وہ کوئی احتیاطی تدابیر اختیار
ـ کر سکتے تھے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ قانون پر عمل کرنے کے قائل ہیں، مصلحت
ـشناسی کے نہیں، اور جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں یہ چیز ایک ایڈمنسٹریٹر کا ہنر نہیں کمزوری ہے۔

بہرحال جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا ——— اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بہت برا ہوا
ـس کا تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا ——— اب اگر یونیورسٹی کو بچانا ہے تو اس بات کی ضرورت
ـہے کہ وائس چانسلر، اساتذہ اور طلباء سب ایک میز پر بیٹھیں، سخن سازی اور اپنے پرستیج

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا خیال ترک کریں اور کھلے دل سے اپنی اپنی غلطی کا اقرار و اعتراف کریں اور آئندہ کے لیے اشتراک و تعاون باہمی سے کام کرنے کا عہد و پیمان کریں۔ علاوہ ازیں ہم گورنمنٹ سے درخواست کریں گے کہ وہ ایک اعلیٰ تحقیقاتی کمیشن مقرر کرے جو گذشتہ پانچ برس کے یونیورسٹی کے تعلیمی، انتظامی اور مالیاتی حالات کا دقت نظر اور تحقیق سے جائزہ لے کر ایک جامع اور مفصل رپورٹ پیش کرے، پھر اس رپورٹ کے مطابق جو لوگ، خواہ وہ کتنے ہی بڑے ہوں، کرپٹ، مفسد اور کام چور پائے جائیں انھیں فوراً اور بے تکلف یونیورسٹی سے خارج کیا جائے، حقیقت یہ ہے کہ یونیورسٹی کا جسم اندر سے اس درجہ فاسد اور متعفن ہو گیا ہے کہ جب تک اس پر عمل جراحی نہ ہوگا وہ صحت مند اور درست نہ ہوگا۔ گورنمنٹ کو اس سلسلہ میں جلد کوئی اقدام کرنا چاہیے۔

رموز عشق:

مؤلفہ ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب:

زیرِ نظر کتاب میں نکاتِ تصوف اور عشق و محبت پر حکیمانہ انداز میں سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اس موضوع پر ایسی کوئی کتاب اردو فارسی یا انگریزی زبان میں موجود نہیں ہے۔ محبت و عشق کی ماہیت و حقیقت کیا ہے۔ عشق شدت محبت کا نام ہے؟ محبت کن مراتب و مدارج کو طے کر کے عشق پر منتہی ہوتی ہے۔ اس کتاب میں انھیں احوال و مدارج کو ایک خاص دلنشیں ترتیب کے ساتھ شرح و بسط سے پیش کیا گیا ہے۔ کتاب متعدد ابواب پر مشتمل ہے۔ محبت یا عشق کی حقیقت، اسباب محبت، عشق حقیقی اور دلائل شرعیہ، عشق اور صوفیہ وجودیہ، عشق مجازی، آثار و ثمرات عشق وغیرہ۔ سائز ۲۰×۲۶/۸ صفحات ۲۰۴ قیمت 15/-

© rasailojaraid.com